تحقیقی مجلہ تصدیق
جلد ۰۱ شمارہ ۰۵، ۲۰۲۳

Article

A TECHNICAL REVIEW OF OBAIDULLHA BAIG'S NOVEL "AUR INSAN ZINDHA HY"

عبید اللہ بیگ کے ناول ''اور انسان زندہ ہے!''کا فنی جائزہ

Dr.Saima Iqbal *[1] , Aamir Abbas Khan[2], Muhammad Saad[3]
[1] Assistant Professor, Department Urdu Govt college University, Faisalabad
[2] M.Phil. scholar, Department Urdu Govt college University, Faisalabad.
[3] Lecturer, Department Urdu, Lahore Leads University, Lahore
*Correspondence: saimaiqbal@gcuf.edu.pk

[1] ڈاکٹر صائمہ اقبال، [2] عامر عباس خان، [۳] محمد سعد

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد [۱]، ایم۔فل اسکالر، شعبہ اردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد [۲]

لیکچرار، شعبہ اردو لاہور لیڈز یونیورسٹی، لاہور [۳]

eISSN: 2707-6229
pISSN: 2707-6210
DOI:https://doi.org/10.56276/tasdiq.v5i01.144
Received:03-05-2023
Accepted:06-07-2023
Online:10-07-2023

Copyright: © 2023 by the authors. This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

ABSTRACT: Obaidullha Baig (1 October 1936 - 22 June 2012) was a scholar, Urdu writer, novelist, columnist, media expert, and documentary filmmaker from Karachi, Sindh, Pakistan. Obaidullah Baig comes out as a novelist who wrote only two novels " Rajpoot" and " Aur Insan Zindha Hai". He introduced the new writers in a new way in the plot and story of these two novels, apart from the usual approach. He has paid special attention to the technical aspects of novel writing. He has given great importance to scenery, narration, and dialogues. The plot of this novel is very strong. The style of the novel is rich and similes and metaphors. The novelist has introduced a beautiful and elaborate allegorical system to present the scenes and convey his message to the reader, which is far from the usual approach. the use of idioms and proverbs in this novel is vivid and real. Such diction indicates the author,s extensive study and ability to speak. In this article, an intellectual review of the novel " Aur Insan Zindha Hai" will be presented.

KEYWORDS: Detailing, Obituary, Supporting Role, Characterization, Plot, Urdu Novel, Review, Obaidullah Baig, Novel, Aur Insan Zinda Hy, Style

اُردو ناول میں عبید اللہ بیگ ایک ایسا معتبر نام ہیں جنہوں نے صرف دو ناول لکھے مگر اُن ناولوں کو لکھنے میں جنھوں نے کڑی محنت کی۔ اُن کے دونوں ناول طویل وقفوں کے بعد سامنے آئے جو ظاہر کرتے ہیں کہ انھوں نے ہر ناول لکھنے میں کسی قدر جان کنی سے کام لیا ہے۔ عبید اللہ بیگ ایک ہمہ جہت شخصیت رہے ہیں۔ جنہوں نے پاکستان ٹیلی وژن میں کام کیا۔ کالم لکھے۔ ڈاکو منٹری فلمیں بنائیں عبید اللہ بیگ کے ان چیدہ مگر چنیدہ کاموں سے اُن کے ادبی قد کاٹھ کا اندازہ ہوتا ہے۔

عبید اللہ بیگ نسلاً ترکمانی مغل تھے۔ اُن کا خاندان باا ثر، علمی پڑھا لکھا اور مہذب خاندان تھا۔ اِس خاندانی پس منظر کے اثرات عبید اللہ بیگ کی شخصیت پر بھی نمایاں طور پر پڑے۔ اُن کی پرورش جس ادبی، تہذیبی اور وضع دار ماحول میں ہوئی ضروری تھا کہ وہ اُن میں جذبہ علم پروری کو نمو دیتا۔ وہ اپنے مغل ہونے پر فخر کیا کرتے تھے اور اپنے آپ کو آخری مغل بھی کہتے تھے۔ عبید اللہ بیگ یکم اکتوبر ۱۹۳۶ء میں مرزا محمود بیگ کے گھر پیدا ہوئے اُن کی تمام اسناد و ریکارڈ میں یہی تاریخ پیدائش ملتی ہے اس لیے اسے سند سمجھا جاسکتا ہے۔ عبید اللہ بیگ کے اصلی نام سے ریکارڈ درج ہیں۔ جبکہ گھر میں اور دوست احباب میں حبیب اللہ بیگ یا محض پیار سے ''اوبی'' کہلائے جاتے تھے۔ عبید اللہ بیگ نے اپنا پہلا ناول ''اور انسان زندہ ہے'' بھی حبیب اللہ بیگ کے نام سے شائع کروایا۔

ناول نگاری میں عبید اللہ بیگ نے فنی پہلوؤں پر خاص توجہ دی ہے۔ ناول میں مکالمہ نگاری کی تکنیک کو ناول نگار نے جس طرح سے برتا ہے۔ وہ عبید اللہ کا ہی خاصہ ہے۔ انہوں نے کرداروں کے مکالموں کے ذریعے تہذیب اور معاشرت کے مطابق مکالمے ادا کروائے ہیں۔ مکالمے سے احساسات اور جذبات کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔ ناول میں منظر نگاری کے دلچسپ مرقعے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ قدرتی مناظر، جنگل کے ماحول وغیرہ کی عکاسی بہترین کی ہے۔ عبید اللہ بیگ کیونکہ ایک شکاری تھے اس لیے ایک شکاری جنگل اور اس کے ماحول کو جن باریکیوں سے دیکھتا ہے عبید اللہ بیگ نے انھی باریکیوں سے ماحول کو دیکھا اور بیان کیا۔ سراپا نگاری کے لیے مصنف نے جن الفاظ کا سہارا لیا ہے وہ شاندار ہیں۔ سارے کا سارا نقشہ آنکھوں کے سامنے کسی فلم کی طرح چلنے لگتا ہے۔

عبید اللہ کا ناول ''اور انسان زندہ ہے!'' ۵۶۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ناول رسالہ ''الشجاع'' میں ناہر سنگھ کے عنوان سے قسط وار شائع ہوتا رہا اور وہاں عبید اللہ بیگ نے حبیب اللہ بیگ کے نام سے لکھا۔ ۱۹۶۰ء میں ان کہانیوں کو ''اور انسان زندہ ہے!'' کے عنوان سے ویلکم بک پورٹ کراچی سے شائع کروایا۔ بارِ اوّل میں مصنّف کا نام حبیب اللہ بیگ ہی لکھا گیا۔ ۱۹۹۳ء میں جب دوسری بار اس ناول کو شائع کروایا تو تب دُنیا حبیب اللہ بیگ کو عبید اللہ بیگ کے نام سے جانتی تھی۔ دوسری بار اس ناول کو شعبہ اشاعت ٹائمز پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ کراچی سے شائع کروایا گیا اور اب کی بار دوستوں اور ناشر کے اصرار پر حبیب اللہ بیگ کے بجائے عبید اللہ بیگ ہی لکھا گیا۔

یہ ناول آزادی سے پہلے کے سچے واقعات پر مشتمل ہے۔ جنھیں مصنّف نے ناول کی صنف میں ڈھال کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار نریندر ہے۔ یہ مرکزی کردار وقت اور حالات کے مطابق چار مختلف ناموں بلکہ چار الگ الگ کرداروں کے روپ میں ڈھلتا جاتا ہے۔ نریندر سے سوم پرکاش پھر رفیق خان اور آخر میں ناہر سنگھ، ڈاکو ناہر سنگھ بنتا ہے۔

یہ ناول بہت سے کرداروں پر مشتمل ہے۔ نریندر اس کا ہیرو ہے یہ قسمت کا مارا ہیرو دنیا کی ستم ظریفی سہتا سہتا ڈاکو ناہر سنگھ بن جاتا ہے اور اس کی موت دکھ بھری اور الم ناک ہے۔ یہ ناول المیہ ہے نریندر کا، نریندر کے والد ٹھاکر سورج سنگھ کا اور تمام انسانیت کا اس ناول میں جہاں ہندوستان میں آباد مسلمانوں اور ہندوؤں کے کلچر، خاندانی وقار اور تہذیب کو دکھایا گیا ہے وہیں اس وقت کے حکمران انگریز کے سرکاری افسران کے رویّوں کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ پلاٹ قصے کو ترتیب دینے کا نام ہے۔ ایک کامیاب فن کار واقعات کو اس طرح ترتیب دیتا ہے جیسے موتی لڑی میں پروئے جاتے ہیں۔ اگر واقعات ایک دوسرے سے پوری طرح پیوست ہوں تو پلاٹ مربوط ہوتا ہے۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی پلاٹ کی تعریف یوں کرتے ہیں:

"مربوط واقعات کا وہ سلسلہ جو کسی داستان یا ناول میں پایا جاتا ہے پلاٹ ہے۔"(۱)

اس ناول کا پلاٹ سادہ، منظم اور پُر اثر ہے۔ ناول نگار نے واقعات کو ایسی چابکدستی سے ترتیب دیا ہے کہ قاری واقعات کے ساتھ ساتھ دریا کی روانی کی طرح چلتا رہتا ہے۔ وہ کہانی کے طلسم میں ایسے ڈوبتا ہے کہ ہر وقت اگلے ہونے والے واقعات کو جاننے کے تجسس میں ناول کو یک سوئی کے ساتھ پڑھتا جاتا ہے۔ اس ناول کے بیشتر واقعات کہانی کے مرکزی کردار نریندر (ڈاکو ناہر) کی ڈائری سے لیے گئے ہیں۔ ناول نگاری خود اس ناول "اور انسان زندہ ہے!" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"جب دیوا کہانی سنا چکا اور اُس کہانی کے ہولناک اثرات دور ہو گئے اور رات کا کھانا کھا لیا گیا تو اُن بزرگ نے نریندر کی ڈائری کے بارے میں بتایا۔۔۔ یہ ڈائری اُن کو ہی ملی تھی! اس طرح، اس کتاب میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں، وہ ضرورتِ شعری، والے اضافوں کے علاوہ بالکل درست ہیں۔"([i])

ناول کے ابتدا میں ہی ڈاکو ناہیر سنگھ کی آدم خود شیر کے ہاتھوں موت ہو جاتی ہے اور اس کے بعد اس سے ملنے والی ڈائری سے اس کی گزشتہ زندگی کے واقعات کا علم ہوتا ہے جن کے سہارے مصنف اس کہانی کو ناول کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ ڈائری سے معلوم پڑتا ہے کہ ناہر سنگھ کا اصل نام نریندر ہے۔ وہ نریندر سے سوم پرکاش پھر رفیق خان اور آخر میں ڈاکو ناہر سنگھ بنا۔ پلاٹ کا حسن قصّوں کی بہتر سے بہتر ترتیب و تنظیم ہے اور عبید اللہ بیگ اس فن سے بخوبی واقف تھے انہوں نے واقعات کو کڑیوں میں جوڑتے ہوئے قاری کو اپنے ساتھ ساتھ چلایا ہے۔ اس ناول میں مرکزی کردار نریندر (ناہر سنگھ) کے ساتھ ہونے والی ستم ظریفوں اور بسنت پور کے رہائشیوں پر ہونے والے ظلم کو دکھایا گیا ہے۔

نریندر ٹھاکر سورج سنگھ کا بیٹا ہے اور انتہائی رحم دل اور مشفق انسان ہے۔ ایک دن جب وہ کالج کے لیے نکلنے لگتے ہیں تو اُن کے مالی کی بیٹی چمپا بھاگی بھاگی آتی ہے اور کہتی ہے نند بھیا۔ باپو مر رہا ہے۔ رام سروپ شدید زخمی ہوتا ہے اور درد سے کراہ رہا ہوتا ہے۔ وہ ڈاکٹر کو بلا کر اس کی مرہم پٹی کرتا ہے اور فیس کے پیسے بھی اسی کے علاج میں خرچ کر دیتا ہے۔ پانچ روز تک وہ رام سروپ کو دیکھنے جاتا رہا۔ ایک

دن رام سروپ کی طبیعت کافی ناساز تھی۔ چمپا بہت پریشان ہو رہی تھی اور رو رہی تھی اور نند سے کہا کہ بھیا میرے باپو کو بچالو۔ نریندر نے اسے تسلی دی اور کہا گھبرانے کی بات نہیں۔ علاج جاری ہے وہ جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ ان جملوں نے چمپا پر پتا نہیں کیسا اثر کیا کہ وہ نریندر پر گر پڑی۔ ایسے لگتا تھا جیسے نریندر نے اسے بانہوں میں لیا ہوا ہے۔ اسی اثناء میں نریندر کے والد نے دیکھ لیا اور نریندر کو گھر سے نکال دیا۔

گھر سے نکالے جانے کے بعد نریندر کو دوست نے دھوکا دیا اور اس کے سارے پیسے لے کر بھاگ گیا۔ نریندر وہاں سے بمبئی چلا آیا اور وہاں اس کی ملاقات حادثاتی طور پر اپنے والد کے کلاس فیلو اور دوست صولت خان سے ہوئی جو کہ اسمگلنگ کی دنیا کا بے تاج بادشاہ تھا اور بمبئی کے سوشل حلقوں میں ایک معزز شہری کی حیثیت سے اہم نام تھا کیونکہ اس کا سارا کام ایجنٹ کرتے تھے۔ صولت علی خان نے نریندر کو سب کچھ بتا دیا اور کہا کہ آپ کے ساتھ صبح آپ کے گھر چلتے ہیں اور آپ کو گھر چھوڑ آتا ہوں لیکن نریندر نے صاف انکار کر دیا۔ صوت علی خان نے نریندر کا لائسنس سوم پر کاش کے نام سے بنوا کر اسے کلکتہ شکار کے لیے بھیجا۔ اسی طرح واقعات سے واقعات جڑتے گئے۔ اس ناول کے پلاٹ کی یہ خوبی ہے کہ واقعات کی کڑیوں کو ایسے جوڑا گیا ہے کہ قاری پڑھتے ہوئے اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا۔

کلکتہ میں نریندر کی ملاقات صولت علی خان کے دوست ہنر ہائینس سلطان ریاست من تانگ سے سوم پر کاش کے نام سے ہوئی۔ وہ اسے اپنی ریاست میں شکار کی غرض سے لے گیا اور واپسی پر کارتوسوں میں بارود کی جگہ کوکین بھر دی۔ ٹرین میں نریندر کی دوستی انگریز مسٹر جیمس اور نعیم الدین خان سے ہوتی ہے۔ وہ شکار کی باتیں کرتے ہیں تو نریندر سے کارتوس دکھانے کے لیے کہا۔ کارتوس دیکھ کر ہلاتے ہیں تو کارتوس ہلانے سے چھروں اور گرداب کی جو آواز آتی ہے وہ نہ آئی۔ تو مسٹر جیمس نے کارتوس کھول کر دکھانے کی فرمائش کی۔ کارتوس کھولے گئے تو اس میں سفوف بھرا تھا۔ یکے بعد دیگرے تین کارتوس کھولے گئے تو سب میں سفوف تھا۔ مسٹر جیمس نے ایک کارتوس نکال لیا لیکن نریندر اس سے بے خبر تھا۔ بمبئی جا کر اس نے صولت علی خان سے سفوف کا ذکر کیا اور ایک کارتوس کھولا گیا تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے اور کہا کہ اس سلطان کا ستیاناس ہو کمبخت نے بچے کو پھنسوا دیا۔ نریندر نے صولت علی خان کو راستے کے تمام واقعات سے آگاہ کیا اور بمبئی چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ ادھر مسٹر جیمس نے کوکین سے بھرا کارتوس اپنے بھائی کیپٹن میکڈانلڈ کو دیا۔ کیپٹن نے تمام ریلوے اسٹیشنز پر پہرے دار لگا دیے تا کہ کوکین کے اسمگلر کو پکڑا جا سکے۔ بمبئی سے دہلی جانے والی ٹرین بڑودہ اسٹیشن پر رُکی تو وہاں مسٹر جیمس کے ساتھ کیپٹن میکڈانلڈ نے سوم پرکاش (نریندر) کو گرفتار کر لیا۔

> ''مسٹر پرکاش، ان دا نیم آف دا برٹش کراؤن آئی ایم اریسٹنگ یو اون دا چارج آف، نریندر کا سر آگے کو جھکا۔ اس سے زیادہ وہ نہ سن سکا اور چکرا کر پلیٹ فارم پر گر پڑا۔۔۔!''(ii)

مسٹر جیمس اور کیپٹن میکڈانلڈ کے بارہا اصرار کے باوجود نریندر صولت علی خان کا نام نہیں بتاتا۔ صولت علی خان نریندر کی گرفتاری کی خبر سنتے ہی خودکشی کر لیتا ہے۔ نریندر کیپٹن کو ہز ہائینس کے بارے میں بتاتا ہے تو کیپٹن کہتا ہے اب میرے بس میں نہیں رہا اس کی تحقیقات اعلیٰ سطح پر ہوں گی۔ آپ کو لکھنؤ بھیجا جائے گا۔

نریندر نے سجن کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ انھوں نے کہا کہ آپ فتح کا میلہ دیکھیں اور اس کے بعد آپ کے معاملے پر غور کرتے ہیں۔ فتح کے میلے کے بعد ہرپال سنگھ نے اپنے آباؤ اجداد کا بدلہ لینے کے لیے مراری اور اس کے ساتھی بھانتوؤں کی مدد سے بسنت پور کو تباہ و برباد کروا دیا۔ سجن، یوسف چچا، منن اور کچھ خواتین کے علاوہ سب گاؤں والوں کو مار دیا گیا۔ نریندر کے اندر بدلے کی آگ بھڑک اُٹھی۔ انتقام کی بھٹی میں جلتا نریندر اکیلے مراری اور لٹیروں کے قافلے میں گھس گیا اور مراری مراری چلاتا ہوا اس کے پاس پہنچا اور مراری کو گولیوں سے بھون ڈالا۔ اس کے بعد نریندر نے ٹھاکر ہرپال سنگھ کو بھی مار ڈالا۔ اس کے بعد نریندر مستقل جنگلوں کا باسی ہو گیا اور نریندر، سوم پرکاش، رفیق خان سے ڈاکو ناہر سنگھ بن گیا۔ جس کے خوف سے بڑے بڑے افسر ڈرتے تھے اور بالآخر نریندر کو ایک خونخوار شیر نے مار ڈالا۔ اس کی آخری رسومات میں مسٹر جیمس، پارکر، کیپٹن میکڈانلڈ، کیپٹن اسد، کرنل ونڈہم، کنور صاحب، نواب عظمت اللہ خان، بسنت پور سے سجن، منن، سید میاں اختر خاں، گلابی کی ماں اور علاقے کی کثیر تعداد نے شرکت کی اور کرنل ونڈہم نے تمام تر تفصیلات پیش کرنے سے روک دیا۔ وہاں ڈاکو ناہر سنگھ نہیں بلکہ نریندر کی رسومات ادا کی جا رہی تھیں۔ جن میں کسم دیدی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔ نریندر کے سوم پرکاش پھر رفیق خان اور اس کے بعد ڈاکو ناہر سنگھ بننے کے دوران پیش آنے والے تمام واقعات کو ناول نگار نے احسن طریقے سے لڑیوں میں پرویا ہے اور یہی اس کے پلاٹ کی اصل جان ہے۔ تمام واقعات کو منظم اور پرکشش ترتیب دے کر مصنف نے پورے ناول کو دلچسپ بنا دیا ہے اور یہی اچھے پلاٹ کی خوبی ہوتی ہے۔ کردار نگاری ناول کا اہم جزو ہے۔ ناول میں جو واقعات پیش آتے ہیں ان کے مرکز کچھ جاندار ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ وہ صرف انسان ہی ہوں۔ حیوانوں سے بھی کردار کا کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ افرادِ قصہ کردار کہلاتے ہیں۔ کردار جتنے حقیقی ہوں گے ناول اتنا ہی کامیاب ہو گا۔ نجم الہدیٰ کردار اور کردار نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ”افسانوی ادب میں کردار ناگزیر ہیں۔ ناول ہو یا داستان، ڈرامہ ہو یا مختصر افسانہ، داستانی مثنوی ہو یا منظوم قصے کی کوئی اور صورت، جہاں کوئی قصہ ملے گا، وہاں کچھ اشخاص بھی ہوں گے۔ ایسے ادب میں ہماری دل چسپی واقعات کی رفتار کے ساتھ ساتھ اشخاص کے طرزِ عمل، افتادِ طبع اور ذہن و مزاج کے مجموعی تاثر سے بھی وابستہ ہوتی ہے۔ قصوں کے ان اشخاص کو کردار اور ان کی فنی پیشکش کو کردار نگاری کہا جاتا ہے۔“(iii)

ناول کا مرکزی کردار نریندر ہے جو کہ ڈاکو ناہر سنگھ کے نام سے مشہور تھا اور بانسی کھیڑے کے گھنے جنگلات میں رہتا تھا۔ پولیس کو بائیس لوگوں کے قتل کے سلسلے میں اس کی تلاش تھی۔ ایک دن اس کی موت آدم خور شیر کے ہاتھوں ہوئی۔ اس کے سامان میں سے ایک ڈائری ملی اور اس سے ڈاکو ناہر سنگھ کی گزشتہ زندگی کے حقائق سے پردہ اُٹھا۔ نومبر ۱۹۳۷ء کی ایک رات گیارہ ساڑھے گیارہ بجے بمبئی کے شہنشاہ ریسٹورنٹ کے سامنے ایک نوجوان غنڈے کے ہاتھوں بدترین تشدد کا نشانہ بن رہا ہوتا ہے۔ صولت خان جو کہ دادا بھائی کے نام سے غنڈوں میں جانا جاتا ہے وہ مداخلت کرتے ہیں اور راؤ کو گالیاں دیتے ہوئے اُس پر گھونسوں کی بارش کر دیتے ہیں۔ وہ نوجوان کو اُٹھا کر بار کے اندر لے جاتے ہیں اور پرائیویٹ کیبن میں بٹھا کر نوجوان کو ایک گلاس پلاتے ہیں جس سے اس کے درد کی شدت کم ہو جاتی ہے۔

نوجوان کو اس شہر میں لاوارث اور اجنبی پا کر صولت علی خان اسے اپنے ساتھ گھر لے جاتے ہیں وہاں جاتے ہوئے راستے میں ہی نوجوان بے ہوش ہو جاتا ہے اور اسے دوسرے دن ہوش آتا ہے تو وہ ایک خوبصورت کمرے میں مسہری پر لیٹے ہوئے ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نبض چیک کر رہے ہوتے ہیں اور ساتھ صولت خان بھی کھڑے ہوتے ہیں اور وہ نوجوان نریندر تھا۔ نریندر ٹھاکر سورج سنگھ کا اکلوتا بیٹا۔ جب ڈاکٹر صاحب انجکشن لگا کر چلے گئے اور ساتھ صولت علی خان بھی تو نریندر نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اس کی نظر ایک بڑی سی تصویر پر پڑی جو چاندی کے فریم میں لگی تھی۔ اس کے اوپر لکھا تھا:

"کرائسٹ مشنری ہائی اسکول، سرآباد۔"

درجہ دہم۔۔۔۱۹۱۷ء

اس تصویر میں اس کے والد اور صولت علی خان ساتھ ساتھ کھڑے تھے، صولت خان نے نریندر سے جب سب احوال و آثار کا پوچھا تو وہ اُن کے کلاس فیلو اور دوست سورج سنگھ کے صاحبزادے تھے۔ صولت علی خان نے پریشانی کے عالم میں گھبرا کر پوچھا سورج سنگھ کیسے ہیں؟ تو اس حال میں کیسے پہنچا؟ تو نریندر نے سب احوال بیان کیا کہ باپو نے ایک غلط فہمی کی وجہ سے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔ کسم دیدی اور میں پتا جی کی منتیں کرتے رہے لیکن انھوں نے ہماری ایک نہ سنی اور فیصلہ سنا دیا:

> "یہ لے اور میری نظروں سے دور ہو جا۔ میں تیرا وجود زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔ انہوں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔
>
> میں زمین پر لوٹ گیا اور چیخنے لگا۔ "مجھے مار ڈالئے، مجھے مار ڈالئے، میں بالکل بے قصور ہوں۔" چند لمحوں کے لیے وہ میری طرف گھور کر دیکھتے رہے۔۔۔ اچانک ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور انہوں نے گرج کر کہا۔ اُٹھ یہاں سے ذلیل کتے دور ہو جا میری نظروں سے۔"[(iv)]

عبداللہ بیگ کے بقول اُن کے بیشتر کردار حقیقی ہیں اور ضرورتِ شعری کے علاوہ واقعات بھی اصلی ہیں۔ انھیں میں مرکزی کردار نریندر ہے جو حقیقی، زندہ وجاوید کردار ہے۔ ایک طرح سے یہ کردار مظلوم بھی ہے۔ اسے ناکردہ گناہ کی سزا دے کر گھر سے نکال دیا جاتا ہے۔ والد سے ملی ہوئی پانچ ہزار پانچ سو کی خطیر رقم اور بہن کسم دیدی کی طرف سے دیئے ہوئے زیور اُن کا دوست پیارے لال دھوکے سے چوری کر کے لے اڑتا ہے۔ ہر جگہ پر نریندر کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے۔ وہ گاؤں چھوڑ کر بمبئی جیسے گنجان آباد شہر میں پناہ لینا ہے۔ صولت علی خان اسے واپس گھر پہنچانے کے لیے منانے کی کوشش کرتے ہیں وہ صاف انکار کر دیتا ہے۔ پر وہ اسے اپنے انڈرورلڈ اسمگلنگ کے دھندے کے بارے بتاتا ہے اور نریندر کو شکار کی غرض سے کلکتے بھیجتے ہیں۔ اُن کے لائسنس سوم پر کاش کے نام سے بنواتے ہیں اور انہیں اپنے دوست ریاست من تانگ کے سلطان ہز ہائینس کے پاس کلکتے بھیجتے ہیں جو کہ شکار کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ نریندر سلطان کو صولت علی خان کا خط دیتے ہیں۔ سلطان انھیں تین دن کے شکار کے لیے اپنی ریاست لے جاتے ہیں اور واپسی پر کارتوسوں میں کوکین بھر کر نریندر کے ساتھ بھیج دیتے ہیں۔

نریندر گلابی کے چچازاد بھائی سجن سے دوستی کا دعویٰ کرتا ہے اور گاؤں پہنچ کر وہ سجن کے سامنے آنے پر پیدا ہونے والی صورت حال پر غور کرتا ہے کہ کیا ہو گا۔ سجن میری دوستی کا دم بھرے گا یا نہیں۔ گلابی نے سجن کو رفیق بھیا (نریندر) کے بارے میں بتایا تو وہ حیران ہوئے کہ میرا دوست رفیق بھیا۔۔۔ کون رفیق۔ کہاں ہیں:

> ''نریندر نے سجن کی طرف دیکھتے ہوئے انگریزی میں کہا۔ سجن میاں میں نے آپ کی دوستی کا دعویٰ کیا ہے، مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ سجن کی آنکھوں سے حیرت اور پریشانی ٹپک رہی تھی۔ وہ چند لمحے تک بت بنا ہوا نریندر کی طرف دیکھتا رہا۔ اچانک اس کی پیشانی کے بل دور ہو گئے۔۔۔ آنکھوں سے حیرت اور پریشانی کے رنگ کے بجائے رحم اور محبت کے تاثرات جھلکنے لگے۔''[v]

اس کے بعد نریندر مستقل طور پر جنگلوں کا باسی ہو گیا۔ اسے انسانوں سے نفرت ہو گئی۔ وہ جنگل میں آنے والے شکاریوں کو قتل کر ڈالتا اور سب سامان لوٹ لیتا۔ آخری دن وہ موتی پوری گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ جہاں پجاری کچھ لڑکے اور عورتیں بیٹھے تھے۔ وہ اُن کو لوٹنے جا رہا تھا یا مدد کرنے یہ معلوم نہ ہو سکا۔ اسے آدم خور شیر نے مار ڈالا۔ نریندر کا کردار ایسا کردار ہے کہ جسے غلط فہمیوں اور سازشوں کے ذریعے اس مقام پر لا کھڑا کیا۔ غلط فہمی پر باپ نے گھر سے نکال دیا۔ دوست نے سب کچھ لوٹ لیا۔ اسمگلروں نے دھوکے سے ایجنٹ بنایا اور وہ پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہوا۔ لکھنؤ جاتے ہوئے پیسے کے لالچ میں اس کی سکیورٹی پر مامور پولیس والوں نے چائے میں نشہ آور دوا ملا کر پلائی اور ٹرین سے نیچے پھینک دیا۔ یہ کردار حقیقی کردار ہے اور جاندار کردار ہے۔ عبید اللہ بیگ کا زندہ کردار نریندر۔

''اور انسان زندہ ہے!'' کے بیشتر واقعات چونکہ حقیقی ہیں اس لیے اس کے کردار زندہ و جاوید ہیں۔ جاندار کرداروں میں بہت سے ضمنی کردار بھی ہیں۔ ذیلی کرداروں میں ٹھاکر سورج سنگھ کا کردار ایک اہم کردار ہے۔ وہ ٹھاکر جس نے غلط فہمی میں اپنی خاندانی جاہ جلال کو قائم رکھنے کے لیے بیٹے اور بیٹی کی ایک نہ سُنی اور نریندر کو گھر سے نکال دیا۔ کیونکہ وہ ٹھاکروں کی مخصوص سوچ کا حامل تھا اور کسی قیمت پر بھی غلطی معاف کرنا نہیں چاہتا تھا۔ سب آنکھیں اشک بار ہیں۔ ذیلی کرداروں میں صولت علی خان کا کردار بھی اہمیت کا حامل ہے۔ صولت علی خان فطرتی طور پر اچھا انسان ہے۔ اسے بھی برائی سے نفرت ہے لیکن مجبوریوں کے تحت وہ برے کاموں میں ملوّث ہو جاتا ہے۔ اس کے والد کی وفات کے وقت اُن کے ذمے ڈھائی لاکھ روپے کا سودی قرض تھا۔ لیکن وہ خوش نہیں۔ سب دوست احباب رشتہ دار اس سے دور ہیں۔ اس نے شادی نہیں کی۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کے بچے اسمگلنگ سے کمائی ہوئی ذلیل دولت سے پرورش پائیں یا اس کی حقیقت کے آشکار ہونے پر اس پر لعنت بھیجیں۔ وہ اس دلدل سے تنگ ہے لیکن نکلنے کا راستہ نہیں ڈھونڈ پا رہا:

> ''میں نے اسی لیے شادی نہیں کی۔۔۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے بچے ذلیل دوست پر غرور کریں یا پرورش پائیں یا میری حقیقت سے آگاہ ہو کر مجھے ذلیل سمجھیں اور میرے اوپر لعنت بھیجیں۔ یہ ہے میرا داستانِ حیات!''[vi]

یہ کردار اُن شریف النفس لوگوں کی عکاسی کرتا ہے۔ جو خاندان کی عزت بچانے کے لیے اسمگلنگ یا کسی دوسرے غلط راستے سے دولت کمانے لگ جاتے ہیں۔ ضمنی کرداروں میں ریاست من تانگ کا سلطان ہز ہائینس منفی کردار کے طور پر سامنے آتا ہے۔ بظاہر وہ شریف انسان ہے لیکن وہ بھی اسمگلنگ جیسے ناپاک دھندے میں ملوث ہے۔ اور پتہ نہیں نریندر جیسے کتنے معصوم نوجوانوں کو اپنا آلہ کار بنا چکا ہے۔ اُس کے ظاہر اور باطن میں تضاد ہے۔ ہز ہائینس، منصور میاں اور چُنے میاں کے ذریعے معاشرے کے اُن افراد کی عکاسی کی ہے۔ جو شرافت کا ڈھونگ رچائے بیٹھے ہیں اور اندر سے جرائم پیشہ افراد کے سرغنہ ہیں۔

عبید اللہ بیگ نے عام روش سے ہٹ کر کیپٹن میکڈانلڈ، انسپکٹر ڈیوڈ پارکر، کرنل ونڈہم اور مسٹر جیمس جیسے کرداروں کے ذریعے برطانوی پولیس افسران کا اچھا عکس دکھایا ہے۔ عموماً برطانوی افسران کو ظالم اور ہندوستانی عوام کے دشمن کے طور پر عوام کے سامنے پیش کیا جاتا رہا ہے۔ بسنت پور کے مسلمان پٹھان قبیلے کے مختلف افراد کے ذریعے اسلام اور پٹھان قبائل کی اعلیٰ ظرفی، مہمان نوازی اور اعلیٰ اخلاق کی نمائندگی کروائی ہے، سجن کی ماں کے ذریعے خالص مشرقی ماؤں کی نمائندگی کروائی گئی ہے۔ ناول نگار نے ناول میں جہاں مختلف کرداروں سے مختلف کام لیے ہیں وہیں بسنت پور کے مسلمانوں کے ذریعے پٹھانوں اور اسلام کی اخلاقی اقدار کی عکاسی کی ہے۔ سجن کی ماں کے ذریعے مشرقی ماؤں کی خالص ممتا کی عکاسی کی ہے۔

افسانوی ادب میں مکالمہ نویسی کی خاصی اہمیت ہے۔ مکالمہ کرداروں کی فطرت، جبلت اور شخصیت کے ساتھ ساتھ ماحول کی بھی نمائندگی کرتا ہے۔ اختصار، برجستگی، اسلوب اور صورت حال کا مکمل ادراک مکالمے کو بہترین شکل دیتا ہے۔ مکالمہ ناول میں بیانیہ جتنی تاثیر رکھتا ہے۔ مکالمہ نگاری سے کردار اور قصہ اپنے فطری انجام کی طرف تیزی سے بڑھتے ہیں۔ مکالمے سے تاثر گہرا ہوتا ہے۔ مکالمے کو تصنع اور آورد سے پاک ہونا چاہیے کیونکہ سادگی اور برجستگی مکالمے کی جان ہوتی ہے۔ مکالمہ زبان، سماج اور عوام سے قریب ہو تو پر تاثیر ہوتا ہے۔ مکالمہ کرداروں پر گہرا اثر چھوڑتا ہے۔ کرداروں کی انفرادی خصوصیات سامنے آتی ہیں اور واقعات پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ ناول کا مکالمہ ڈرامے کے مکالمے سے الگ ہوتا ہے۔ کہانی کے بے شمار گوشوں کی وضاحت، کرداروں کے جذبات اور احساسات کی بہترین تنظیم صرف مکالمے کے ذریعے ممکن ہے۔ وکی پیڈیا پر مکالمہ کی تعریف کچھ یوں کی گئی ہے:

> ”مکالمہ (انگریزی Dialogue :یا dialogi) تحریر یا گفتگو کے دوران ایسی بات چیت کو کہتے ہیں، جو دو افراد کے درمیاں ہو یا کسی ادبی تصنیف یا ڈرامے کے صورت میں اسٹیج پر پیش کیا جائے۔ “(vii)

عبید اللہ بیگ نے اپنے ناول ”اور انسان زندہ ہے!“ میں مکالمہ نگاری پر بھی کافی توجہ دی ہے۔ انہوں نے کرداروں سے اُن کی تہذیب اور معاشرت کے مطابق مکالمے ادا کروائے ہیں۔ مکالموں کی ادائیگی میں کرداروں کے شعبوں پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ مکالموں کے ذریعے وہ مرکزی کردار کی زندگی کے واقعات بیان کرتے ہوئے کہانی کے انجام کی طرف بڑھتے ہیں۔ منفی کرداروں سے اُن کے مطابق اور مثبت کرداروں سے اُن کی خاصیت کے مطابق مکالموں کی ادائیگی پر زور دیا گیا ہے۔ مکالموں کے ذریعے مختلف کرداروں

کے احساسات اور جذبات کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔ سورج نگر کے تعلقہ دار کنور مردان علی خان جب ناہر سنگھ کے ساتھی بھگو کو گرفتار کر کے لے آتے ہیں تو کرنل ونڈ ہم اُن سے تفتیشی انداز میں گفتگو کرتے ہیں:

"تمہارا نام۔۔۔؟

بھگو، حضور، بھگوان داس

کہاں کے رہنے والے ہو؟

موضع بسنت پور تحصیل اورئی کا۔

ناہر سنگھ کے گروہ میں کب شامل ہوئے؟

دو سال پہلے حضور، اس کا گروہ نہیں ہے۔

تو وہ تنہا ہے؟

جی حضور

ناہر کے ساتھ سے پہلے کس کے گروہ میں تھے۔

کسی کے ساتھ نہ تھا سرکار، ملازمت کرتا تھا۔

کہاں کہاں ملازمت کی ہے؟

راجہ ٹکرا کا شکاری تھا، پندرہ روپیہ مہینہ ملتا تھا۔ اس سے پہلے حضور میں مکنجی صاحب (مکینزی) کا ملازم تھا۔ پنکھا کھینچنے پر۔

اگر تم ناہر سنگھ کو گرفتار کرا دو تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔ بولو! پکڑاؤ گے اُسے؟

بھگو خاموش کھڑا رہا۔

کیا کہا میں نے جواب دو۔

خاموشی

جواب دے

خاموشی

بول۔ الّو کے پٹھے۔ گونگا کیوں بن گیا ہے؟ ونڈ ہم نے شیر کی طرح گرج کر کہا۔"[viii]

"اور انسان زندہ ہے!" میں مختصر مکالموں سے لے کر دو دو تین تین صفحات کے مکالمے بھی موجود ہیں۔ جن میں نریندر، ڈیوڈ پارکر اور مسٹر جیمس کے مکالمے اور بریلی اسٹیشن پر مسٹر گرانٹ اور نریندر کے مکالمے شامل ہیں۔ مسٹر گرانٹ اور نریندر کے درمیان ہونے والی گفتگو کا کچھ حصہ ملاحظہ فرمائیں۔

"پھر آپ لوگوں نے مجھے ایسے غیر معتبر انسان کے ساتھ کیوں بھیجا؟

نریندر نے تعجب سے پوچھا۔

بظاہر تو اس کا کوئی معقول جواز نہیں ہے، ویسے اس کا انتخاب بھی کیپٹن نے خود کیا تھا۔ شاید اس لیے کہ رام نرائن رشوت لے کر کام پورا نہ کرنے کے لیے مشہور ہے۔۔۔ سمجھ گئے آپ؟ گرانٹ نے سگریٹ کیس نکال کر نریندر کے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ پولیس والوں سے خدا بچائے، عجیب قسم کے لوگ ہیں آپ بھی!

نریندر نے سگریٹ نکال کر ہنستے ہوئے کہا۔

یقیناً ہم عجیب لوگ ہیں۔ آپ کا خیال درست ہے۔

گرانٹ نے ماچس جلائی اور اپنا سگریٹ سلگایا۔

مسٹر گرانٹ، کمال کا ایکٹر ہے رام نرائن پھر تو، بظاہر کیسا غریب، بے ضرر اور مسکین معلوم ہوتا ہے۔ مگر کیپٹن نے اسے میرے ساتھ بے کار بھیجا۔!

کیوں؟ گرانٹ نے پوچھا۔

کیونکہ میں رام نرائن یا کسی اور کو رشوت دے کر فرار ہونا ہی نہیں چاہتا تھا۔

نریندر نے مسکرا کر کہا۔

مجھے آپ کے الفاظ کی صداقت میں پورا یقین ہے۔ گرانٹ نے جواب دیا۔ تو پھر آپ کا ویسے فرار ہونے کا ارادہ ہے؟

آپ مجھے غلط سمجھے مسٹر گرانٹ، میں ایک شریف خاندان کا فرد ہوں اور اس قسم کا کوئی خیال میرے دل میں نہیں۔

ارے آپ تو برا مان گئے، میں نے تو مذاقاً کہا تھا۔"(ix)

عبید اللہ بیگ کرداروں سے اُن کی تہذیب، معاشرت اور شعبے کے مطابق مکالمے ادا کروانے میں مہارت رکھتے ہیں۔ بسنت پور میں گلابی اور ہر فلاں خان کے نریندر کے ساتھ طویل مکالمے بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ بسنتی بنگلہ میں نریندر اور گلابی کے مابین ہونے والی گفتگو کا کچھ حصہ ملاحظہ کریں:

"رفیق بھیا کیا یہ پستول بھرا ہوا ہے۔۔۔ کمرے کے اندر سے گلابی کی آواز آئی

نریندر ایک دم اُچھل پڑا اور اس کا دل دھڑکنے لگا، مگر پھر اسے خیال آیا کہ پستول تو گلابی جنگل میں ہی دیکھ چکا تھا،

ہاں بھیا چلا مت دینا۔ اس نے جواب میں کہا۔

اطمینان رکھئے مگر بڑا اچھا پستول ہے۔ کتنا خوبصورت ہے یہ۔

گلابی نے کہا۔

ارے بھائی کوئی چپل مل جائے گا۔
نریندر نے پیر دھو کر گلابی کو آواز دی۔
ہاں ہاں، ابھی لایا۔
گلابی چپل لایا، نریندر ان کو پہن کر کمرے میں گیا۔ گلابی نے بڑی عمدگی سے کوٹ پر برش کیا تھا۔
اس کی دھول، گھاس پھوس اور چھوٹے چھوٹے لاتعداد جنگلی کانٹے صاف ہو چکے تھے۔۔۔
آپ سجن بھیا کے کپڑے پہن لیجیے۔ آپ کے ٹھیک آئیں گے۔
نا بھئی، بسنت پور والے کہیں گے کہ میں سجن میاں کی اترن پہنے ہوئے ہوں، میرے یہی کپڑے ٹھیک ہیں۔
نریندر نے شیونگ بکس کھولتے ہوئے کہا جو گلابی نے پہلے لا کر فرش پر رکھ دیا تھا۔"(x)

مکالمہ نگاری کے حوالے سے ناول نگار نے بڑی چابکدستی سے کام لیا ہے۔ وہ کرداروں کے مزاج کے مطابق مکالمہ نگاری کرتے ہیں۔ مکالموں پر کردار کے شعبے اور مزاج کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ اس اثر کو عبید اللہ بیگ نے بخوبی اپنے ناول کے مکالموں میں برتا ہے۔

داستانوں کی طرح ناول میں بھی منظر نگاری کے اچھے خاصے مرقعے ملتے ہیں۔ ناول نگار قدرتی مناظر کو مختلف واقعات کے پسِ منظر کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ قدرتی مناظر کے علاوہ معاشرتی تقاریب اور باقی مختلف موقعوں کے نقشے بھی ناول کی دلفریبی میں اضافہ کرتے ہیں۔ بے جا مبالغہ آرائی اور لفّاظی سے اجتناب منظر کے حسن کو بڑھاتے ہیں۔ اس لیے داستان کی نسبت ناول میں منظر نگاری کرتے ہوئے بے جا مبالغہ آرائی سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے ناول کے منظر، داستانوں سے مختلف اور بہتر ہوتے ہیں۔ منظر نگاری میں فطرتی رنگ برقرار رکھنا چاہیے۔ عبید اللہ بیگ نے اپنے ناول "اور انسان زندہ ہے!" میں منظر نگاری کے بہت اچھے نقشے کھینچے ہیں۔ اُن کے مناظر کے نقشوں میں فطری پن موجود ہے۔ منظر نگاری چاہے قدرتی مناظر کی ہو یا معاشرتی تقاریب کی انہیں اس پر عبور حاصل ہے۔ عبید اللہ بیگ شکاری بھی تھے۔ اس لیے مظاہرِ فطرت سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے بڑی چابکدستی سے مناظر کو ناول میں پرویا ہے:

"شام ہو چکی تھی، آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے، شام کے اندھیرے بادلوں کی سیاہی اور گھنے درختوں کی سبزی نے مل کر ماحول کو کافی تاریک کر دیا تھا۔ یوں تو فضا خاموش تھی مگر کبھی کبھی دور سے کسی سانبھر کے بولنے، چیتلوں کے کوکنے اور مور کے ماؤں ماؤں سے فضا میں ارتعاش پیدا ہو جاتا تھا۔"(xi)

جب ڈاکٹر رستم انجکشن لگا کر چلا جاتا ہے۔ صولت علی خان نریندر کو سہارا دے کر دوبارہ لٹا دیتے ہیں اور کمرے سے باہر چلے جاتے ہیں نریندر آنکھیں کھول کر کمرے کا جائزہ لیتا ہے۔ ناول نگار نے بڑے احسن انداز میں اس کی منظر کشی کی ہے:

"یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ خوب آراستہ پیراستہ قالین کا فرش تھا۔ جس پر گلاب کے بڑے بڑے پھول بنے تھے۔ کمرے کی دو دیواروں سے بہت عمدہ صوفے لگے ہوئے تھے۔ کھڑکیوں پر سبز

رنگ کے ریشمی پردے لٹکے تھے، دیواروں پر بہت سے تصویریں فریموں میں آویزاں تھیں۔ اس نے تصویروں کو بغور دیکھا۔ دو تصویریں کسی نواب کی تھیں جو درباری لباس میں ملبوس ہاتھ میں تلوار لیے کھڑا تھا، کچھ تصویریں شکار کی تھیں۔ شیر، سانبھر، ریچھ تقریباً ہر جانور کی تصویریں تھیں اور ہر تصویر میں اس نے اپنے محسن صولت کو پہچانا۔ انہیں شکار کا بہت شوق معلوم ہوتا ہے۔ اس نے سوچا۔"(xii)

مناظرِ فطرت کی عکاسی کرنا عبید اللہ بیگ کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ وہ قدرتی منظر کو لفظوں کی مدد سے یوں بیان کرتے ہیں کہ قاری کو وہ ماحول آنکھوں کے سامنے دکھائی دیتا ہوا لگتا ہے۔ مظاہرِ فطرت کی عکاسی کا ایک منظر ملاحظہ کریں:

"اتنی دیر میں سورج نکل آیا۔ کُہر چھٹ گیا اور فطرت اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ دعوتِ نظارہ دینے لگی۔۔۔ گھاس کے میدان میں چھوٹی بڑی جھاڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ کچھ کانٹوں سے بھری ہوئی تھیں۔ کچھ پھولوں سے اور کچھ دونوں سے، میدان کے کنارے گھنے جنگل کا سلسلہ تھا اور جنگل کی دیوار کے پیچھے نیچی نیچی سرسبز و شاداب پہاڑیوں کا لامتناہی سلسلہ تھا۔ طرح طرح کے چھوٹے بڑے پرندے نئے سورج کے استعمال میں چہچہا رہے تھے۔ کچھ ریلوے لائن کے کنارے تاروں پر بیٹھے تھے۔ کچھ میدان میں بکھری ہوئی جھاڑیوں پر پھدک رہے تھے۔"(xiii)

منظر نگاری ناول کا جزو لازم ہے۔ منظر نگاری کرتے ہوئے فطری پن برقرار رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اچھا ناول نگار ان مناظر کے فطرتی رنگ کو برقرار رکھتا ہے۔ جس سے ناول دلکش ہو جاتا ہے۔ عبید اللہ بیگ کے فنّی کمالات میں منظر نگاری کا ایک اور نقشہ دیکھئے وہ نریندر کی ارتھی کے جلوس کی منظر کشی کر رہے ہیں:

"نارنگ پور کی سڑکوں پر بڑا ہجوم ہے۔۔۔ ٹھاکر سورج سنگھ کے اکلوتے بیٹے کی ارتھی کا جلوس نکل رہا ہے؛ ایسا جلوس شاید پھر نظر نہ آئے۔۔۔ شاید!۔۔۔ ارتھی کے آگے آگے ایک بوڑھا ہاتھی ہے۔ ہاتھی کی سونڈ میں تلوار ہے، گردن پر ایک دبلا پتلا سوکھا سہا۔ مہاوت ہے جو بار بار رومال سے آنسو پونچھتا جا رہا ہے۔ ہاتھی کی پشت پر سفید داڑھی کا ایک مسلمان مولوی بیٹھا ہے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے ایک عَلم تھام رکھا ہے۔ عَلم کا سبز پھریرا ہوا میں اڑ رہا ہے۔ یہ کسی مسلمان کا جنازہ ہے یا ہندو کی ارتھی۔۔۔؟ ہاتھی کے پیچھے پنڈتوں اور برہمنوں کا ہجوم ہے، گھنٹے اور سنکھ کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔۔۔ انہوں نے سورج سنگھ کے اکلوتے بیٹے کی ارتھی اُٹھا رکھی ہے۔"(xiv)

ناول نگار نے منظر نگاری کے خوبصورت مرقعے پیش کیے ہیں۔ وہ منظر نگاری یوں کرتے ہیں کہ قاری اصل منظر کو اپنی آنکھوں کے سامنے فلم کی طرح چلتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ انہوں نے منظر نگاری میں لفظوں کے رنگ بھر دیئے ہیں۔

تمام بدن یعنی سر سے پاؤں تک کی عکاسی کرنا سراپا نگاری کہلاتا ہے۔ ناول میں کہانی کہتے ہوئے بہت سے کرداروں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ کرداروں کی شکل وصورت، قد کاٹھ، رنگت وغیرہ کو بیان کر کے ناول کے حسن کو بڑھایا جاتا ہے۔ سراپا نگاری بھی حقیقت پر مبنی ہونی چاہیے۔ بے جا مبالغہ آرائی ناول کے حسن کو نقصان پہنچاتی ہے۔ اچھا ناول نگار کردار کی نفسیات کے مطابق حقیقت پسندی پر مبنی سراپا نگاری کرتا ہے۔ عبید اللہ بیگ کے ناول ''اور انسان زندہ ہے!'' میں سراپا نگاری کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ وہ کرداروں کے شعبوں اور رویّوں کے مطابق سراپا نگاری کرنے کے فن سے بخوبی واقف ہیں:

وہ بمبئی کے غنڈوں کے مخصوص حلیوں کے مطابق راؤ نامی غنڈے کی سراپا نگاری یوں کرتے ہیں:

> ''نوجوان نے کتے کو آخری پوری ڈال کر نظریں اُٹھا کر اسے دیکھا۔۔ وہ بمبئی کے غنڈوں کے مخصوص انداز کا حامل تھا۔ لمبا قد، بھاری جسم، بڑی بڑی مونچھیں، چھوٹی چھوٹی سرخ آنکھیں اور میلے کچیلے کپڑے۔''(xv)

وہ دادا بھائی (صولت علی خان) کی شکل وصورت کی عکاسی بھی بڑے احسن انداز میں کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ صولت علی خان خفیہ فروش ہے اور بمبئی کے سماجی حلقوں میں شرافت کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے۔ شریفانہ انداز میں ان کی سراپا نگاری ملاحظہ ہو:

> ''اس نے پہلی مرتبہ دادا بھائی کو دیکھا، ایک بہت شریف شکل وصورت کا انسان اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ لمبا قد، مضبوط گٹھیلا جسم، سانولی رنگت، ہلکی خشخشی داڑھی اور قدرے موٹی مونچھیں، سیاہ شیروانی جن کی آستینوں سے ململ کے کرتے کی آستینیں باہر نکلی تھیں۔''(xvi)

ناول نگار کے وسیع المطالعہ اور کثیر المشاہدہ ہونے کا ثبوت ہے کہ وہ ہر کردار کی سراپا نگاری اس کے مخصوص حلقے یا گروہ کے مطابق کرتے ہیں اور اس میں ذرا سا بھی جھول نہیں آنے دیتے۔ ناول نگار کا کمال دیکھیں کہ انسان تو انسان انھوں نے جانوروں کی سراپا نگاری بھی بہت خوب کی اور کرتے بھی کیسے نا، وہ شکاری تھے اور جانوروں کے حلیے سے بخوبی واقف تھے۔ بسنت پور کے پٹھان قبیلے کے ایک ہاتھی کی سراپا نگاری ملاحظہ فرمائیں جس کا نام سرمست خاں تھا:

> ''سرمست خاں غیر معمولی قد و قامت کا ہاتھی تھا۔ اس کا قد تقریباً نو فٹ ہو گا لیکن تھا دبلا پتلا، اس کا جسم بوڑھی کھال کی سلوٹوں اور جھریوں سے بھرا پڑا تھا، جگہ جگہ سے بدن کا سیاہ رنگ اُڑ گیا تھا اس کے دانت بھی تقریباً چار چار فٹ لمبے اور بہت موٹے تھے جن کی نوک پر پیتل کے خول چڑھے ہوئے تھے، نریندر نے اتنے بڑے ہاتھی کم ہی دیکھے تھے۔ اس کا حلیہ گواہ تھا کہ وہ بہت معمر اور تجربہ کار ہاتھی ہے۔''(xvii)

مجموعی طور پر ناول نگار نے سراپا نگاری کے اعلیٰ نقشے کھینچے ہیں۔ لفظوں کی مدد سے وہ اپنے کرداروں کی یوں تصویر پیش کرتے ہیں کہ قاری کے سامنے کردار اپنی اصل شکل وصورت کے ساتھ آتا ہے۔

ناول کے پلاٹ میں موجود واقعات، حالات اور معاملات کی مکمل تفصیل و وضاحت کو جزئیات کہتے ہیں۔ ناول کے پلاٹ یا قصے کے لیے جزئیات کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ جزئیات نگاری سے ناول کے حسن کو بڑھایا جاتا ہے۔ جزئیات میں تواتر و تسلسل ناول میں ربط اور آہنگ پیدا کرتا ہے۔ عبید اللہ بیگ کے ہاں بھی جزئیات نگاری کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ واقعات یا معاملات کے بیان میں وہ جزئیات نگاری سے قصے کے لطف کو دوبالا کر دیتے ہیں۔ ان کے ہاں الفاظ کی کثرت ہے۔ قصے کے بیان کے دوران وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو گنوا کر جزئیات نگاری کے اعلیٰ مرقعے پیش کرتے ہیں۔ جزئیات نگاری کے حوالے سے فتح کے میلے کے لیے ایک خیمے کی سجاوٹ کا منظر ملاحظہ کریں:

> ''اس بڑے خیمے میں چاندنی اور قالین کا فرش ہو رہا تھا، صدر نشین کے لیے ایک بہت پرانا غالیچہ، مسند اور طلسمی گاؤ تکیے رکھے تھے جن کا رنگ اڑ چکا تھا۔ صدر نشین کے دائیں بائیں دو رویہ گاؤ تکیوں کی قطار لگی تھی اور چھوٹی چھوٹی ریشمی مسندیں بچھی تھیں۔ خیمے کی چھت سے ایک بہت پرانا اور بڑا بلوری جھاڑ لٹکا تھا اور خیمے کے چاروں گوشوں میں آفتابی فانوس آویزاں تھے۔ صدر نشین کی نشست پر سرخ رنگ کا پردہ تنا ہوا تھا اور پردے پر ایک چالیس انچ لمبی نال والی توڑے دار بندوق، ایک سیدھی اصفہانی تلوار، ایک خمدار فولادی شمشیر، ایک چھوٹی برچھی اور ایک لمبا بلم اور ایسے ہی چند دیگر جانے پہچانے اور اجنبی ہتھیار آویزاں تھے۔ خیمہ اگر بتیاں اور لوبان کی خوشبو سے بھرا ہوا تھا۔''(xviii)

ناول نگار کی جزئیات نگاری کا ایک اور نمونہ دیکھیں۔ جس میں وہ فتح کے میلے کی تیاریوں کا ذکر کر رہے ہیں:

> ''گاؤں میں ایک ہنگامہ بپا تھا۔ تنگ گلیوں اور کچی سڑکوں پر جھاڑو دی جا رہی تھی۔۔۔ جھنڈیاں گاڑھی جا رہی تھیں۔ کیلے کے پتوں سے آراستہ دروازے نصب کیے جا رہے تھے۔ آس پاس کے علاقوں سے دیہاتی جوق در جوق بیل گاڑیوں پر، گھوڑوں پر یا پیدل چلے آ رہے تھے۔ کل فتح کا میلہ لگنے والا ہے۔ یہ سب اس کی تیاریاں ہیں۔ شام ہوتے ہوتے گاؤں باہر سے آئے ہوئے مردوں، عورتوں اور بچوں سے بھر گیا۔ جگہ جگہ ہنڈولے گڑ گئے اور ان کی چرخ چوں اور بچوں کے شور و غل، مداریوں کے ڈگڈگی بجانے کی آواز، آزاد منش، بے فکر دیہاتی نوجوانوں کی بانسریوں کی تانیں، بیل گاڑیوں کے پہیوں کی کھڑ کھڑاہٹ اور ہانکنے والوں کی ہٹو بچو سے تمام گاؤں گونج رہا تھا۔''(xix)

میلے کی تیاری کی عکاسی میں ناول نگار نے چھوٹی چھوٹی چیزوں کا ذکر کر کے جزئیات نگاری کی اعلیٰ مثالیں پیش کی ہیں۔ یہ ناول نگار کے وسیع مطالعہ اور مشاہدہ کی دلیل ہے کہ اس نے عوامی میلے ٹھیلے کی جزئیات کو بڑے اچھے انداز میں قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ جس کو پڑھتے ہوئے قاری خود کو میلے کے ماحول میں پاتا ہے۔ جس کے سامنے یہ سب کچھ ہو بہو ہو رہا ہے اور وہ لطف اندوز ہو رہا ہے۔ مصنّف کی قوتِ مشاہدہ کسی منظر کو پیش کرتے ہوئے اس کی جزئیات کو بیان کرنے میں اہم کردار رکھتی ہے۔ مصنف یا ناول نگار نے مشاہدے کے بل

بوتے پر چھوٹی چھوٹی چیزوں کے بیان سے جزئیات نگاری کے اعلیٰ مرقعے سامنے لا کر خود کے قوتِ مشاہدہ کو منوایا ہے۔ مرکزی کردار نریندر جب گنج شہیداں کے قبرستان میں داخل ہوتا ہے۔ تو وہاں ناول نگار قبروں کی تختیوں، درختوں، جھاڑیوں، درختوں کے تنوں، جنگلی گلاب، گنبد اور عمارت کی اشیاء وغیرہ کے ذکر سے جزئیات نگاری کے اعلیٰ نقشے کھینچے ہیں۔ جو اُن کے مشاہدہ کی قوت کا منہ بولتا ثبوت ہیں:

> "نریندر کی نظریں دائیں بائیں قطار در قطار اونچی نیچی، کچی پکی، نئی پرانی، بے نشان و گمنام اور تعویذوں، کتبوں سے مرصع قبروں، درختوں کے تنوں، جنگلی گلاب اور چمیلی کی جھاڑیوں، گھاس پھوس اور خودرو پھول دار اور خاردار چھوٹے بڑے پودوں کا بتدریج جائزہ لیتی ہوئی قبرستان کے آخری سرے پر بنی ہوئی ایک مختصر سی گنبد دار پرانی عمارت پر ٹھہر گئیں۔ دروازے سے جو روش قبرستان کے درمیان سے گزرتی تھی اور اسی عمارت پر ختم ہوتی تھی۔"(xx)

جزئیات نگاری میں بھی ناول نگار نے خوب محنت سے کام لیا ہے وہ جزئیات نگاری کے خوبصورت مناظر پیش کرتے ہیں۔ ناول میں مختلف واقعات، تقاریب اور قدرتی مناظر کی تصویر کشی کرتے ہوئے تمام چیزوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

اسلوب کسی بھی تخلیق کار کی پہچان ہوتا ہے۔ یہ تخلیق کار کے ذخیرہ الفاظ اور بُنت کاری کو ظاہر کرتا ہے۔ ادیب اپنے اسلوب کے ذریعے تحریر میں لفظوں کے پیکر تراشتا ہے۔ اسلوب تحریر کے چہرے کے مانند ہوتا ہے۔ جو مصور کے ذہن کی عکاسی کرتا ہے۔ اسلوب تخلیق کار کی شخصیت کا پرتو بھی ہوتا ہے۔ تخلیق کار کی قوتِ مشاہدہ اور مطالعہ جتنا وسیع ہو گا اسلوب اُس قدر دلکش اور دل آویز ہو گا۔ اسلوب میں مصنوعی پَن اور غیر حقیقی پَن قاری پر بوجھ بنتا ہے۔ دلچسپ اور سادہ اسلوب قاری کی دلچسپی کا سبب بنتا ہے۔ اسلوب تخلیق کار کے بات کہنے کا ڈھنگ ہوتا ہے۔ یہ فطری اور خداداد صلاحیت ہوتی ہے۔ پروفیسر انور جمال اسلوب کی تعریف کچھ یوں کرتے ہیں:

> "اسلوب فنی تجربے کے ناگہانی یا اتفاقی حسن کی بجائے اس کے طویل، ارادی اور مسلسل ارتباط کو ظاہر کرتا ہے۔"(xxi)

عبید اللہ بیگ کے ناول "اور انسان زندہ ہے!" کا اسلوب دلکش، سادہ اور مرصّع ہے۔ دلچسپ اور سادہ اسلوب کی بدولت قاری اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا اور اس کا دل کر رہا ہوتا ہے ایک ہی نشست میں ناول پڑھ ڈالوں۔ الفاظ کے پیکر تراشنے میں انھیں کمال حاصل ہے۔ اُن کا اسلوب لطیف ہے اور چاشنی سے بھرپور ہے۔ کہیں رومانوی اسلوب کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ بعض مقامات پر اُن کا اسلوب شاعرانہ نوعیت کا بھی ہے۔ رومانوی اسلوب کے لیے ناول اقتباس دیکھیں۔

> "اُسے آنکھیں بند کئے کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ اچانک اسے محسوس ہوا کہ وہ ہوا کے دوش پر بادلوں کے ساتھ اُڑ رہا ہے۔ بادلوں کے لطیف لمس سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور اس کے جسم میں سنسنیاں دوڑ گئیں اور۔۔۔ نرم۔۔۔ نرم۔۔۔ سرمئی اور ہلکے نیلگوں بادل۔۔۔ وہ ان کے ساتھ فضائے بسیط میں اس طرح اڑ رہا تھا جیسے متلاطم سمندری لہروں پر کاغذ کی ناؤ۔۔۔!! اور اس

نے دیکھا کہ بادلوں کے ساتھ گلاب اور موتیا کے پھولوں کی نرم و نازک پنکھڑیاں بھی لاکھوں کروڑوں بلکہ ان گنت تعداد میں اڑتی چلی جارہی ہیں۔"(xxii)

عبید اللہ بیگ نے اپنے ناول میں انتہائی سادہ دلکش اسلوب اپنایا ہے۔ لفظوں کی پیکر تراشی میں وہ آسان و عام فہم الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ ناول کا اسلوب سادہ اور منظم ہے۔ اسلوب کی دلکشی کا سہرہ ناول نگار کے سر ہے۔ ناول نگار نے لفظوں کی مدد سے اسلوب کو خوب نکھارا ہے۔ تحریر رواں، سلیس اور سادہ ہے جو اسلوب کی خوبصورتی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

محاورات ضرب الامثال کا استعمال:

محاورات و ضرب الامثال کی مدد سے بڑی سے بڑی بات کو ایجاز و اختصار کے ساتھ بیان کیا جاسکتا ہے۔ یہ جملے میں خوبصورتی و حسن پیدا کرتے ہیں۔ ان کی مدد سے گہری سے گہری اور حکمت و دانائی کی باتیں بڑی آسانی اور سادگی کے ساتھ کہی جاسکتی ہیں۔ "فیروز اللغات" میں محاورہ کی تعریف یوں درج ہے:

"وہ کلمہ یا کلام جسے اہلِ زبان نے لغوی معنی کی مناسبت یا غیر مناسبت سے کسی خاص مفہوم کے لیے مخصوص کر لیا ہو۔"(xxiii)

ناول نگار نے اپنے ناول میں محاورات و ضرب الامثال کا برجستہ استعمال کیا ہے۔ موقع محل کی مناسبت سے ان کا استعمال کر کے آسانی و سادگی کے ساتھ گہری گہری باتیں کہی ہیں۔ وہ محاورات و ضرب الامثال کے استعمال کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔ کافی تعداد میں اپنے ناول میں محاورات و ضرب الامثال کا استعمال کیا ہے۔ خدا خدا کر کے، تین پانچ کرنا، بے نیل و مرام، طشت از بام ہونا، دن دونی رات چوگنی ترقی کرنا، قافیہ تنگ کرنا، رسّی جل گئی بل نہ گیا، بے بھاؤ کی پڑنا وغیرہ وغیرہ ناول سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں۔ جب رفیق خاں (نریندر) اور سجن برآمدے کے باہر کھڑے ہوتے ہیں اور شجاعت خاں اُن کے پاس پہنچ کر کہتے ہیں کہ اختر بھائی نے اصول بنائے ہوئے ہیں کہ ناشتہ سب کے ساتھ کرو، کھانا سب کے ساتھ کھاؤ، حقہ سب کے ساتھ پیو، شطرنج سب کے ساتھ کھیلو۔ وہ ناشتہ کرنے کے لیے سجن کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں اوپر سے رفیق خاں (نریندر) آجاتے ہیں۔ ناشتہ لگنے میں دیر ہو جاتی ہے تو شجاعت خاں یوں گویا ہوتے ہیں:

"بھوک کے مارے آنتیں قُل پڑھ رہی ہیں۔ پہلے تمہارا اور گلابی کا انتظار تھا۔ اب رفیق میاں تشریف لے آئے۔ غرض کہ اپنے علم ٹھنڈے ہوئے جاتے ہیں۔"(xxiv)

عبید اللہ بیگ نے محاورات و ضرب الامثال کا خوبصورت استعمال کیا ہے۔ وہ موقع محل کے مطابق کلام میں محاورات و ضرب الامثال کا استعمال کرتے ہیں۔ اُن کی اس خوبی کی وجہ سے عبارت میں حسن پیدا ہوا ہے جس سے بڑی گہری اور حکمت والی باتیں آسانی سے محاورات و ضرب الامثال کی مدد سے کہی ہیں۔

ناول نگار نے ناول میں اشعار کا برجستہ اور خوبصورت استعمال کیا ہے۔ مرکزی کردار کے ذریعے اشعار کا برمحل استعمال ناول نگار کی شعر فہمی اور شاعری سے لگاؤ پر دلالت کرتا ہے۔ اشعار کے استعمال نے ناول کے اسلوب میں حسن پیدا کیا ہے۔ مرکزی کردار کی زبانی

زندگی کی بعض تلخ حقیقتوں کو شعر کے ذریعے پیش کیا ہے۔ ناول نگار کی یہ تکنیک کہانی میں حسن پیدا کرتی ہے اور اسے خوبصورتی وروانی کے ساتھ انجام کی طرف لے جاتی ہے۔

ناول کے اندر پہلا جو شعر نظر آتا ہے وہ غالب کا ہے۔ مجموعی طور پر بھی ناول نگار نے زیادہ اشعار غالب کے استعمال کیے ہیں۔ ناہر سنگھ کی ڈائری کے سرورق اس کا نام اور نیچے غالب کا مشہور و معروف شعر درج تھا۔ جس میں ناہر سنگھ کا پرانا "سوم پرکاش" درج تھا جو صولت صاحب نے لائسنس بنواتے ہوئے نریندر سے سوم پرکاش کروادیا تھا:

> "وہ ناہر سنگھ کی ڈائری تھی۔ پہلے صفحہ پر ایک نام بہت خوشخط لکھا تھا۔۔۔ "سوم پرکاش"۔۔۔ اس کے نیچے غالب کا شعر لکھا تھا۔
>
> یاربّ زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
>
> لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہوں میں

ایک اور جگہ میر انیس کا خوبصورت شعر استعمال کیا گیا ہے۔ جہاں مرکزی کردار نریندر سی آئی ڈی انسپکٹر گرانٹ کی لاش پر کھڑا زندگی کی بے ثباتی پر غور کر رہا ہوتا ہے۔ اشعار کا استعمال عبارت کو خوبصورت بناتا ہے۔ عبید اللہ بیگ نے ناول میں کلاسیکل اشعار کا خوبصورت استعمال کیا ہے۔ جس سے ناول نگار کا شاعری سے لگاؤ ظاہر ہوتا ہے۔ ناول نگار کا کمال ہے کہ اشعار کی مدد سے زندگی کی تلخیوں کو بیان کیا ہے۔

فنی اعتبار سے ناول اور انسان زندہ ہے منظر نگاری، سراپا نگاری اور مکالمات کی وجہ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ناول میں منظر نگاری اور سراپا نگاری پر مصنف نے خاصی محنت کی ہے۔ یہ تکنیک ناول کو نیچرل اور جان دار بناتی ہے۔ مکالماتی انداز اور کرداروں کی رنگارنگی ناول کی کہانی کو آگے بڑھانے میں بہت مددگار ثابت ہوتی ہے۔ کہانی کا پلاٹ بہت مضبوط ہے۔ ناول کا اسلوب تشبیہات اور استعارات سے مزین ہے۔ ناول نگار نے مناظر پیش کرنے اور اپنی بات قاری تک پہنچانے کے لیے ایک خوبصورت اور وسیع تشبیہاتی نظام متعارف کروایا ہے جو عامیانہ روش سے ہٹ کر ہے۔ اس ناول میں محاورات اور ضرب الامثال کی ادائیگی برجستہ اور حقیقی ہے۔ اس طرح کی ڈکشن مصنف کے وسیع المطالعہ اور قادرالکلام ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

حوالہ جات

i ۔ "عبید اللہ بیگ، اور انسان زندہ ہے"، کراچی: ٹائمز پریس، ۱۹۹۳ء، مقدمہ

ii ۔ ایضاً، ص:۱۴۱-۱۴۲

iii ۔ ڈاکٹر نجم الہدیٰ، کردار اور کردار نگاری، پٹنہ: بہار اردو اکیڈمی، ۱۹۸۰ء، ص:۳

iv ۔ "عبید اللہ بیگ، اور انسان زندہ ہے"، ص:۴۹

v ۔ ایضاً، ص:۳۵۳-۳۵۴

vi ۔ ایضاً، ص:۸۳

vii ۔ https://ur.wikipedia.org/wiki/مکالمہ date:13-08-2021

viii ۔ "عبید اللہ بیگ، اور انسان زندہ ہے"، ص:۲۴-۲۵

ix ۔ ایضاً، ص:۲۵۶-۲۵۷

x ۔ ایضاً، ص:۳۳۹-۳۴۰

xi ۔ ایضاً، ص:۷

xii ۔ ایضاً، ص:۵۸

xiii ۔ ایضاً، ص:۲۳۹

xiv ۔ ایضاً، ص:۵۵۷-۵۵۸

xv ۔ ایضاً، ص:۴۸

xvi ۔ ایضاً، ص:۵۱

xvii ۔ ایضاً، ص:۳۸۸

xviii ۔ ایضاً، ص:۴۰۰-۴۰۱

xix ۔ ایضاً، ص:۴۲۴-۴۲۵

xx ۔ ایضاً، ص:۴۸۹

xxi ۔ پروفیسر انور جمال،:"ادبی اصطلاحات"، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، اشاعت سوم ۲۰۱۲ء، ص۱۹

[xxii] ۔ ”عبید اللہ بیگ، اور انسان زندہ ہے“، ص ۳۷۲

[xxiii] ۔ مولوی فیروزالدین: ”فیروز اللغات“، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، س ن، ص ۶۲۰

[xxiv] ۔ ”عبید اللہ بیگ، اور انسان زندہ ہے“، ص ۳۵۵